حسرت کی سیاسی زندگی

چند جھلکیاں

عبدالقوی دسنوی

عبد القوی دیسنوی

حسرت کی سیاسی زندگی

چند جھلکیاں

حلقۂ احباب ۔ دیسنہ
پٹنہ

قیمت قسم دوم .... عمہ

تار کا پتہ
ریمیو

ملنے کا پتہ
ڈراشرز ایمپوریم لمیٹڈ
ہیوم پلس بلڈنگ ۔ فیروز شاہ مہتا روڈ بمبئی

ٹیلیفون
۲۶۲۸۸۶

مطبوعہ ... پریس محمد علی روڈ بمبئی ۳

نسرین جہاں اور عاتکہ دیسنوی

دونوں بچیوں

کے

نام

غالباً ایک سال کا عرصہ گذرا جب میں نے حسرت کی سیاسی زندگی پر ایک مختصر سا مقالہ لکھا تھا لیکن عنوان کی اہمیت اور مضمون کی تشنگی مجھے اکساتی رہی کہ میں اس مقالہ پر کچھ اور محنت کروں۔ چنانچہ اپریل ۱۹۵۵ء میں جب اپنے وطن دیسنہ (پٹنہ) پہنچا تو کتب خانہ "الاصلاح" دیسنہ سے مستفید ہونے کا خاطر خواہ تو نہیں لیکن کچھ حد تک موقع ملا۔ یہ کتب خانہ اپنے سینے میں پرانے اخبارات و رسائل کا بڑا عمدہ علمی ذخیرہ چھپائے ہوئے ہے۔ یہ مقالہ انھیں فرصت کے دنوں کی یادگار ہے۔ اس تعطیل میں مجھے ان رسائل کو اطمینان سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انھیں رسائل میں "اردوئے معلی" کی مختلف جلدیں نظر سے گزریں جن میں حسرت کی سیاسی زندگی کے اکثر واقعات پڑھنے کا موقع ملا۔ اردوئے معلی کے علاوہ دوسرے رسائل سے بھی حسرت کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئیں جنھیں میں نے اس مقالہ میں شامل کر لیا ہے۔ ستمبر ۱۹۵۵ء میں اس مقالہ کو رسالہ "فروغ اردو" میں اشاعت کیلئے لکھنؤ بھیجا تھا۔ جس کی رسید مجھے ایک ماہ بعد اس طرح ملی:

"......آپ کا مضمون "حسرت کی سیاسی زندگی" معلومات کا بے بہا خزانہ ہے، مگر فروغ اردو کی کم مائیگی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس قدر طویل مضمون شائع کیا جا سکے......"

میرے لکھنے پر دسمبر ۱۹۵۵ء میں اس کی پہلی قسط فروغ اردو میں شائع ہوئی ہے۔

اسی مقالہ کو میں کچھ اور اضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں مجھے اسکا احساس ہے کہ حسرت کی زندگی کے اس پہلو کو میں زیادہ واضح نہیں کر سکا اور نہ ہی مواد کے انبار لگا سکا ہوں، اس میں صرف حسرت کی سیاسی زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اور کچھ موٹی اور اہم باتیں بھی لکھدی گئی ہیں۔

بزرگ محترم جناب عبدالماجد صاحب دریابادی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور پروفیسر سید عبدالحی رضا صاحبان نے اس مقالہ سے متعلق مواد فراہم کرنے میں میری اکثر مقام پر رہبری کی ہے۔ محترم سردار جعفری صاحب نے "پیش لفظ" لکھکر میری بڑی ہمت افزائی کی۔ میں ان تمام حضرات کی بزرگانہ شفقت کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا رہوں گا۔

دوستوں میں تاج بھائی میرے بڑے کرم فرما ہیں۔ وہ اس کی طباعت میں بڑی دلچسپی لیتے رہے۔ انکے علاوہ عبدالعزیز حرنیٹ، عبدالحمید حرنیٹ، صدیق جنگی، شیخ احمد اور مجاہد صاحبان کی ہمدردیاں شامل حال ہیں۔ انھیں میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

بمبئی

عبدالقوی دسنوی
۱۰ جنوری ۵۶ء

پیش کرتا ہوں اور اس وقت کا انتظار کرتا ہوں جب وہ اپنے ادبی سفر میں اپنے سے آگے چلنے والوں کے دوش بدوش آجائیں گے اور ان کے قدم سے قدم ملاکر اس منزل کے حصول میں مدد کریں گے جس کی تلاش ادب کا کارواں ہمیشہ سے کرتا رہا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔ یہ منزل حاصل ہو جانے کے بعد پھر آگے چلی جاتی ہے۔ اور اس طرح شوق کی آگ کو تیز کرتی رہتی ہے۔

سردار جعفری
بمبئی ۳ جنوری ۱۹۵۶ء

(۳)

حسرت موہانی کی سیاسی زندگی پر نوعمر ادیب عبدالقوی دسنوی کا پیش نظر مقالہ ایک اچھا مطالعہ ہے جو اردو ادب کے باغ میں ایک نئی کلی کھلنے کی بشارت لے کر آیا ہے۔ مقالے کا انداز بہت سلجھا ہوا ہے اور زبان میں بڑی سادگی و روانی ہے اور یہ اچھے ادب کی پہلی شرط ہے۔ موضوع اور مواد کے اعتبار سے اس مقالے کی اہمیت مسلّم ہے لیکن حسرت کی شاعری کے جس پہلو کو ان کی غزل گوئی کے نام پر عام طور سے نظر انداز کردیا جاتا ہے اسے ابھار کر عبدالقوی صاحب نے اپنے مقالے کی اہمیت میں اضافہ کردیا ہے۔
میں عبدالقوی دسنوی کو انکی کامیابی پر مبارکباد

غالباً ایک سال کا عرصہ گذرا جب میں نے حسرت کی سیاسی زندگی پر ایک مختصر سا مقالہ لکھا تھا لیکن عنوان کی اہمیت اور مضمون کی تشنگی مجھے اکساتی رہی کہ میں اس مقالہ پر کچھ اور محنت کروں۔ چنانچہ اپریل ۱۹۵۵ء میں جب اپنے وطن دیسنہ (پٹنہ) پہنچا تو کتب خانہ "الاصلاح" دیسنہ سے مستفید ہونے کا خاطر خواہ تو نہیں لیکن کچھ حد تک موقع ملا۔ یہ کتب خانہ اپنے سینے میں پرانے اخبارات و رسائل کا بڑا عمدہ علمی ذخیرہ چھپائے ہوئے ہے۔ یہ مقالہ انھیں فرصت کے دنوں کی یادگار ہے۔ اس تعطیل میں مجھے ان رسائل کو اطمینان سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انھیں رسائل میں "اردوے معلیٰ" کی مختلف جلدیں نظر سے گزریں جن میں حسرت کی سیاسی زندگی کے اکثر واقعات پڑھنے کا موقع ملا۔ اردوے معلیٰ کے علاوہ دوسرے رسائل سے بھی حسرت کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوئیں جنھیں میں نے اس مقالہ میں شامل کر لیا ہے۔ ستمبر ۱۹۵۵ء میں اس مقالہ کو رسالہ "فروغ اردو" میں اشاعت کیلیے لکھنؤ بھیجا تھا۔ جس کی رسید مجھے ایک ماہ بعد اس طرح ملی:

"......آپ کا مضمون "حسرت کی سیاسی زندگی" معلومات کا بے بہا خزانہ ہے، مگر فروغ اردو کی کم مائگی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس قدر طویل مضمون شایع کیا جا سکے......"

میرے لکھنے پر دسمبر ۱۹۵۵ء میں اس کی پہلی قسط فروغ اردو میں شایع ہوئی ہے۔

اسی مقالہ کو میں کچھ اور اضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں مجھے اسکا احساس ہے کہ حسرت کی زندگی کے اس پہلو کو میں زیادہ واضح نہیں کر سکا اور نہ ہی مواد کے انبار لگا سکا ہوں، اس میں صرف حسرت کی سیاسی زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اور کچھ موٹی اور اہم باتیں بھی لکھدی گئی ہیں۔

بزرگ محترم جناب عبدالماجد صاحب دریابادی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور پروفیسر سید عبدالحی رضا صاحبان نے اس مقالہ سے متعلق مواد فراہم کرنے میں میری اکثر مقام پر رہبری کی ہے۔ محترم سردار جعفری صاحب نے "پیش لفظ" لکھکر میری بڑی ہمت افزائی کی۔ میں ان تمام حضرات کی بزرگانہ شفقت کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا رہوں گا۔

دوستوں میں تاج بھائی میرے بڑے کرم فرما ہیں۔ وہ اس کی طباعت میں بڑی دلچسپی لیتے رہے۔ انکے علاوہ عبدالعزیز حزیں، عبدالحمید حزیں، صدیق جنگی، شیخ احمد اور مجاہد صاحبان کی ہمدردیاں شامل حال ہیں۔ انھیں میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

بمبئی

عبدالقوی دسنوی

۱۵ جنوری ۵۶ء

ہی میں ایک رسالہ "اردوئے معلیٰ" کے نام سے جاری کیا جس کے ذریعے سوراج اور آزادی کا بیج لوگوں کے دلوں میں بونے لگے۔ ابھی رسالے کے اجراء کو چار ہی سال ہوئے تھے کہ حسرت ایک بلائے ناگہانی میں گرفتار ہو گئے۔ واقعہ یوں تھا کہ "اردوئے معلیٰ" کا "مصطفیٰ کمال" نمبر فروری و مارچ ۱۹۰۸ء میں حسرت نے نکالا تھا جس میں علیگڑھ کالج کے ایک طالب علم کا مضمون "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" کے عنوان سے شایع ہوا تھا جس کا لب ولہجہ اگرچہ اتنا سخت و ترش نہ تھا لیکن حکومت کی نظر عتاب اس پر پڑنے لگی اور حسرت دفعہ ۱۲۴ (الف) کی زد میں آ گئے۔ حکومت نے ان پر مقدمہ چلایا۔ اس موقع پر حسرت نے اپنے بلند کردار کا ثبوت پیش کیا۔ اور باوجود حکومت کی کوشش کے انھوں نے مضمون نگار کا نام بتلانے سے صاف انکار کیا اور تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اس زمانے کے سیاسی جوش کے علاوہ انگریزوں کا خوف وہراس لوگوں پر اس قدر غالب تھا کہ مقدمہ کی پیروی کے لئے حسرت کو ایک بھی بیرسٹر یا وکیل نہ مل سکا۔ چنانچہ چند ہی پیشیوں کے بعد انھیں ۲ سال قید بامشقت[1] کی سزا سنا دی گئی اور ساتھ ساتھ پانچسو روپیہ جرمانہ

---

[1] بزرگ محترم جناب عبدالماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں:
"حسرت کی ہمت کا اصلی امتحان ۱۹۰۸ء کا جیل تھا جب ساری مسلم قوم (بشمول بزرگ قوم نواب وقارالملک مرحوم) ان سے سخت ناراض ہو گئی تھی اور ہندوؤں میں بھی جیل جانا ایک وقت کی بات تھی۔" (مکتوب بنام عبدالقوی دسنوی)

بھی کیا گیا۔ اس پہلی دفعہ قید وبند کی زندگی میں حسرت نے کن کن مصائب ودشواریوں کا مقابلہ کیا۔ خود ان کی زبانی سنیئے:

"۴؍[1] جون ۱۹۰۸ء کو اردوئے معلیٰ پر مقدمہ سڈیشن قائم ہوا اور ۴؍ اگست ۱۹۰۸ء کو ۲ سال قید سخت اور پانچسو روپیہ جرمانہ کا حکم سنایا گیا۔ علیگڑھ میں ہر شخص جانتا ہے اور اس لئے مجسٹریٹ علیگڑھ کو بھی غالباً اس بات کا علم تھا کہ اردوئے معلیٰ اور کتب خانہ اردوئے معلیٰ کی بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہے۔ تاہم ہمیں مجسٹریٹ علیگڑھ کے ان احکام کی شکایت نہ اب ہے اور نہ کبھی ہوئی اور نوعیت مقدمہ کے لحاظ سے ان کی غیر معمولی سختی پر کبھی تعجب ہوا اور نہ اب ہے۔ اس لئے کہ جب تک ہندوستان میں مجسٹریٹ پولیس کے ہی اعلیٰ افسر رہیں گے اور خفیہ پولیس کی ان جھوٹی رپورٹوں کو سن کر جن کی تردید کا ملزم کو کوئی موقع نہ ملتا ہے نہ مل سکتا ہے۔ فیصلہ مقدمہ سے قبل ہی قائم کر لیا کریں گے جب تک کہ وہ خود ایک شخص پر الزام لگائیں گے اور وارنٹ

---

[1] "مشاہدات زنداں" اردوئے معلیٰ ۱۹۰۸ء

جاری کریں گے اور پھر خود ہی اس کا انصاف کرنے بیٹھیں گے
اسوقت تک مقدمات میں عموماً اور پولیٹکل مقدمات میں خصوصاً
خالص انصاف یا رعایت کی امید کرنا اول درجہ کی حماقت ہے
کیونکہ پولیٹکل مقدمات میں ایک اور خرابی یہ بھی زیادہ ہوجاتی
ہے کہ ملزم اکثر فرنگیوں اور فرنگی حکومت کا دشمن سمجھا جاتا ہے
اور اس لحاظ سے یوروپین جج یا مجسٹریٹ کے دل میں اسکی جانب سے
بغض و کدورت کا پیدا ہونا ایک ایسا قدرتی امر ہے جس کی نسبت
ہم اس کو الزام نہیں دے سکتے۔"

جیل کے اندر حسرت کو بہت زیادہ سختی برداشت کرنا پڑی خصوصاً
چکی پیسنے کی مصیبت سے انھیں سال بھر نجات نہ ملی خود لکھتے ہیں:

"ڈیڑھ اور دوسے سال کو الہ آباد جیل میں معمول سے زیادہ سختی
برداشت کرنی پڑی اور تقریباً سال بھر تک ایک من آٹا پیسنے
کی سخت مشقت سے سابقہ رہا جو عام طور پر دیگر صوبوں میں
ایک ماہ سے زیادہ نہیں لی جاتی۔ ہم پولیٹکل قیدیوں کی خوش
قسمتی دیکھئے کہ جیل کے اندر ایک اور جیل میں رہنا پڑتا ہے
یعنی ایک خاص وارڈ یا بعض اوقات ایک خاص کوٹھری کے
علاوہ جیل ہی میں نہ کسی دوسری جگہ جا سکتے نہ کسی سے بات کر سکتے۔"

علیگڈھ جیل سے الہ آباد جانے کے لئے حکومت نے سوائے سفر خرچ کے
ایک پیسہ خوراک کے لئے نہیں دیا جس کا تذکرہ حسرت اس طرح کرتے ہیں:

"واضح ہو کہ گورنمنٹ نے ہمارے اخراجات سفر کے لئے کرایہ
ریل کے سوا ایک پیسہ بھی نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ راستے میں
قیدیوں کی خوراک کے لئے ایک آنہ فی کس روز کے حساب سے
جو رقم ملتی ہے وہ بھی نہیں دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے
دن صبح تک تھوڑے سے بھونے چنے کے سوا اور کچھ نہ ملا۔"

الہ آباد جیل پہونچنے کی خبر حسرت نے اپنے والد صاحب کو ایک آدمی
کے ذریعے بھجوادی تھی مگر سختیوں کا یہ عالم تھا کہ جب ان کے والد جیل میں
ان سے ملنے آئے تو ملاقات کی اجازت نہ ملی۔ ناچار ملنے کی آرزو اور تمنا
لئے وہ گھر واپس گئے۔ بیمار پڑے تو حسرت کو خبر تک نہ دی گئی اور آخر وہ
اپنے نور نظر اور لخت جگر سے ملنے کی تڑپ لئے عازم راہ عدم ہوئے۔ حسرت
اس واقعہ پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"موصوف نے بکوشش تلاش کرکے میرا پیام اسی روز پہنچا
دیا۔ کیونکہ دو ہی چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ والد مرحوم
نے مجھ سے ملنے کی درخواست پیش کی ہے لیکن افسوس کہ
سپرنٹنڈنٹ جیل نے ان کی درخواست کو کسی مصلحت سے منظور

نہیں کیا اور وہ ناکام واپس گئے۔ مجھ کو اس واقعہ سے کسی قدر افسوس ہوا۔ اور خصوصاً اسلئے کہ اپیل کے متعلق جو کچھ کارروائی ہو رہی تھی اس کا کچھ بھی حال معلوم نہ ہو سکا...... والدہ مرحوم کو میرے اس طرح گرفتار مصیبت کا بے انتہا قلق تھا۔ چنانچہ جیل سے واپس آنے پر اکثر اعزا کی زبانی معلوم ہوا کہ اس صدمہ کے بعد انکی صحت کبھی صحیح نہیں رہی اور آخر کار میری عدم موجودگی میں انھوں نے انتقال فرمایا۔ جیل میں مجھ کو اس واقعہ کی خبر تک نہ ہوئی۔"

سختیاں اور پابندیاں جو حسرت پر لگائی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ جو ظالمانہ برتاؤ اور ناروا سلوک حسرت کے ساتھ کیا گیا وہ بہت سخت تھا حسرت لکھتے ہیں:

"تھوڑی دیر بعد جیلر صاحب نازل ہوئے اور میرے ساتھ کے تمام اخباروں اور کاغذوں کو باستثنا دیوان حافظ اپنے سامنے جلا کر خاکستر کر دیا اور دفتر میں حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا۔"

ایک واقعہ اور حسرت کی زبانی سنیئے:

"راقم الحروف کی نگاہ دور بیں نہیں ہے اس لئے پڑھنے لکھنے

کے اوقات کو چھوڑ کر باقی ہر وقت عینک کی ضرورت رہتی ہے۔ چنانچہ علی گڑھ کے سپرنٹنڈنٹ نے بعد معائنہ عینک لگا کے پڑھنے کی اجازت دیدی تھی۔ لیکن الہ آباد والوں نے اس کو کسی طرح گوارا نہیں کیا اور عینک کو داخل دفتر کر کے راقم کی بے دست و پائی کو ایک درجہ اور بڑھا دیا۔ ع

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

دفتر میں مجھ کو غضب آلود اور قہر بار نگاہوں سے دیکھ کر ارشاد ہوا کہ اگر یہاں ٹھیک طور سے نہ رہو گے تو بیمار بنا کر اسپتال بھیج دئے جاؤ گے۔ اور وہیں مار کر خاک کر دیے جاؤ گے۔"

ناانصافی ہوگی اگر حسرت کی سیاسی زندگی میں بیگم حسرت کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ بیگم حسرت کا شمار ان عورتوں میں ہے جنھوں نے حصول آزادی کے لئے بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا کیا ہے۔ وہ شوہر کی ہر موقع پر مونس و غمخوار رہیں اور ہمت افزائی کرتی رہیں۔ اگر ان کی ہم خیالی اور مستقل مزاجی انکا ساتھ نہ دیتی تو شاید وہ گھریلو جھمیلوں میں الجھ کر رہ جاتے اور سیاسی زندگی میں اپنی مستقل مزاجی کا ثبوت نہ پیش کر سکتے۔ چنانچہ حسرت خود لکھتے ہیں:

"گرفتاری کے وقت راقم الحروف کی شیر خوار لڑکی نعیمہ علاوہ

جیل تھی اور اتفاق سے مکان پر والدہ نعیمہ اور ایک خادمہ کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا لیکن ان کی ذات سے اس نازک وقت میں بربنائے سیادت و تائید ربانی حیرت انگیز حوصلہ و استقلال کا اظہار ہوا۔ خود پریشان ہوکر راقم کو بھی مغموم کرنے کے بجائے انھوں نے دوسرے ہی دن بذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا ہے دیکھکر جیلہ کارپردازان زنداں متحیر رہ گئے۔ راقم کا دل مضطرب امر حق کی پیروی کے باعث یونہی قوی تھا لیکن ان کی یہ تحریر کہ تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔" تقویت مزید کا باعث ہوئی۔ بھائی صاحب کو انھوں نے تار دے کر بلوا لیا تھا۔ جن کے ہمراہ وہ جیل میں مجھ سے ملنے بھی آئیں اور جبتک مقدمہ چلتا رہا ہر ہفتہ آیا کیں اور آخر تک ان کی جرأت و ہمت میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔"

چنانچہ ۱۹۳۷ء میں جبکہ بیگم حسرت کا انتقال ہوا تو حسرت کو بے حد صدمہ ہوا۔ اسی صدمے نے حسرت سے یہ اشعار لکھوائے:

غیر ممکن ہے ترے بعد ہوس ۔۔۔ دل کسی اور سے لگانے کی

اب نہ دل ہے نہ وہ ذخیرۂ شوق ۔۔۔ توڑ دوں کنجیاں خزانے کی

حقیقت یہ ہے کہ حسرت پر جو افتاد پڑی تھی وہ بڑے سے بڑے رہنما کے ارادوں کو ڈگمگا دینے اور حوصلوں کو مضمحل کر دینے کیلئے کافی تھی لیکن حسرت نے خوشی کے ساتھ برداشت کیا۔ رقمطراز ہیں:

"حقیر بمصداق اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں۔ ایک عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا۔ ان تمام باتوں کو برداشت کیا اور بے تکلف برداشت کیا۔ کچھ تو جانب حق ہونے کے یقین سے دل کو تقویت تھی اور کچھ تو اس فطری بے غمی اور بے پرواہی کا فیضِ عام تھا۔ جس کی بدولت فقرا ہر حال میں راضی اور خوش رہ سکتے ہیں کہ فقیر کے دل پر ان واقعات وحالات کا ذرہ برابر اثر نہ ہوا۔"

حسرت کے مندرجہ بالا خیالات کی جھلکیاں ان کے اس شعر میں نمایاں ہیں ؎

خوشی سے ختم کر لے سختیاں قید فرنگ اپنی
کہ ہم آزاد ہیں بیگانۂ رنج دل آزاری

حسرت کی زندگی فقیرانہ تھی۔ اردوئے معلےٰ کی آمدنی پر وہ قناعت کر رہے تھے۔ ان کے پاس اتنی رقم کہاں تھی کہ وہ پانچ سو روپیہ بطور جرمانہ

ادا کرتے۔ چنانچہ ان کی وہ محبوب اور نادر کتابیں جنھیں انھوں نے بڑی محنت و مشقت اور کوشش و کاوش سے جمع کیا تھا اور جسے وہ بہت عزیز رکھتے تھے صرف ساٹھ روپیہ میں حکومت کی طرف سے نیلام کر دی گئیں جسکا اظہار حسرت نے بڑے پُردرد الفاظ میں کیا ہے:

"اس جرمانہ کی بدولت کتب خانہ اردوئے معلّیٰ کی جو حالت ہوئی اس کا بیان نہایت دردناک ہے۔ جن کتابوں کو راقم حروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں اور دقتوں سے بہم پہونچایا تھا، جن کتابوں میں بہت سے ایسے نایاب اور قلمی نسخے، دواوین شعراء وغیرہ کے تھے جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی ان سب کو پولیس کے جاہل جوان تھیلوں میں اس طرح بھرے گئے جس طرح لوگ لکڑی اور بھس لے جاتے ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست بنانا تو درکنار کسی نے ان کو شمار تک نہیں کیا۔ اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گزری اس کا ذکر کرتے ہوئے ہمارا دل دکھتا ہے اس لئے اس سے قطع نظر ہی مناسب ہے۔ اس جبر و ظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے۔"

الغرض مجسٹریٹ کے بس میں جس قدر تھا انھوں نے حسرت کو دکھ دیا۔ لیکن تجویز کردہ دو برس کی میعاد میں ہائی کورٹ نے ایک برس کی تخفیف کر دی

چونکہ حسرت جرمانہ کی رقم ادا نہ کر سکے تھے اس لئے اس تخفیف میں ۶ ماہ کا اضافہ کر دیا گیا۔

ابھی دس ماہ حسرت نے جیل میں کاٹے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بڑے بھائی سید روح الحسن کو یہ خدشہ ہوا کہ وہ جائداد جو حسرت کو ترکہ میں ملی ہے حکومت اس کو بھی نہ نیلام کر دے۔ چنانچہ زرِ جرمانہ انھوں نے ادا کر دیا۔ اس طرح حسرت کو ایک سال جیل میں رہنے کے بعد رہائی نصیب ہوئی۔

حسرت نے سختیوں اور پابندیوں کے باوجود دورانِ قید و بند میں جیل کی سلاخوں کے اوٹ میں بھی غزل خوانی کی جس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

"تمام مذکورہ بالا موانعات کے باوجود یہ کل غزلیں دن بھر چکی پیسنے کے اثناء میں کہی جاتی تھیں اور بوقت شام ایک قیدی دوست کو لکھوا دی جاتی تھیں جو بحیثیت برقنداز نسبتاً زیادہ آزاد تھے۔"

یہ غزلیں اکثر سیاسی ہیں۔ اسی زمانے کی ایک غزل کے چند اشعار سنئے:

مایۂ عشرت بے حد ہے غمِ قید وفا
میں شناسا بھی نہیں رنجِ گرفتاری کا
جورِ پیہم نہ کرے شانِ توجہ پیدا

دیکھو بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

انھی زمانے کا ایک اور شعر سنیئے جس میں خدا اور رسول سے عقیدت مندی
کا اظہار کرتے ہیں ؎

دل کو ہو تجھ سے واسطہ لب پہ ہو نام مصطفےٰ
وقت جب آئے اے خدا خاتمہ ہو اس کا

مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس زمانۂ اسیری میں جہاں ان کی ہتھیلیاں آبلوں سے
پُر اور خون آلود نظر آتی ہیں، چکی چلانے میں جن کی جلن اور ٹیسیں انھیں
بے چین کر دیتی ہے، وہیں منہ سے عشقیہ کلام بھی نکلتا ہے ؎

ہوش میں کیا آئیں نہیں چھوڑتا
جلوۂ جاناں کا نظارہ ہم کو
ان کی حیا کہتی ہے معلوم ہے
حال ترے شوق کا سارا ہم کو

راہ تیری اس قدر دیکھی ہوئے غفلت شعار
میری آنکھیں بن گئیں سرمایہ دارِ انتظار

مانگے خط کی آرزو ہے، ان کی آمد کا خیال
کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبارِ انتظار

بڑھ چلا جوشِ آرزو حسرت
ختم ہونے کو آئی قیدِ فرنگ

مطالعۂ حسرت کے دوران میں میری نظر سے ایسے مضمون نگار بھی گزرے
ہیں جنھوں نے حسرت کی ان کیفیات کا مذاق اڑایا ہے کہ کہاں قید و بند کی
زندگی، کہاں یہ رنگین خیالیاں۔ لیکن ایک شاعر جو حساس بھی ہو اس کے لئے
یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ مجھے تو اظہر علی فاروقی کی یہ بات بہت پسند آئی اور
حقیقت سے قریب معلوم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہمیں تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حسرت کا یہ فطری جذبہ
اس دیہاتی عورت کے فطری جذبے سے ٹکر کھاتا ہے جو
پسینے میں لت پت چکی پیستے پیستے گنگنانے لگتی ہے اور اپنی
ٹیسوں کو بھلا دینا چاہتی ہے۔ اس کے جذبات کچھ اس طرح
تراوش کرنے لگتے ہیں

آئی گئی سندھ سنورے پیا کی ..... ہوئے موسے رام

اسکے پاس غم غلط کرنے کا یہی ایک وسیلہ ہے"

پروفیسر صاحب نے بات بڑے پتے کی کہی ہے۔ حسرت جو بیک وقت شاعر

بھی تھے اور سیاسی بھی۔ فرنگیوں کے عتاب میں پڑ کر آہنی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیے جاتے ہیں، جہاں وہ تھے اور فرنگیوں کا چار خانہ استبداد۔ چکی کی مصیبت سے چور ہو کر حسرت کچھ دیر کے لئے اپنے غم کو غلط کرنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ عشقیہ شاعری کا سہارا لیتے ہیں۔ حسرت نے اپنی اس متضاد کیفیت کا اظہار اس شعر میں کیا ہے ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

اس کی وجہ وہ اس شعر میں بتلاتے ہیں ؎

ہر چند ہے دل شیدا حریّتِ کامل کا
منظورِ دعا لیکن ہے قیدِ محبت بھی

دورانِ زندانِ فرنگ میں یوں تو حسرت پر جس قدر بھی ہو سکتا تھا تکلیفوں اور مصیبتوں کا پہاڑ ڈھایا گیا لیکن چکی کی مشقت جو کہ ہمیشہ اُن پر عائد رہی بڑی تکلیف دہ تھی۔ اس کے باوجود ان کے آہنی ارادوں، راسخ عقیدوں اور عزم و استقلال میں ذرّہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ اپنے ایک شعر میں فرنگیوں سے اس طرح مخاطب ہیں ؎

جو چاہے سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو، کی ہو جو شکایت بھی

حسرت جیل میں رہے تو اسی حریت کا گن گاتے اور آزادی کا مدھر راگ الاپتے رہے اور باہر آئے تو وہی سرمستی، وہی سرشاری، وہی ولولہ و جوش و خروش اور وہی ہاہاہی قائم رہی ؏

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے

ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

ہو جنہیں شوقِ شہادت انہیں کیا خوف بھلا
قید کا مرحلۂ نرم اگر ہے درپیش

ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس کی جو بنیاد پڑی تھی اس میں دو نظریے کارفرما تھے۔ ایک نظریہ اعتدال پسندی کا اور دوسرا انتہاپسندی کا۔ اعتدال پسند جماعت (فریقِ نرم) میں وہ حضرات تھے جو انگریزوں کی مخالفت نہیں کر رہے تھے، بلکہ وہ ان کے شاکی تھے۔ وہ انگریزوں کی حکومت کے خلاف نہ تھے بلکہ حکومت کے نظم و نسق میں ترمیم و تنسیخ کرنا چاہتے تھے۔ اس جماعت کے روحِ رواں دادا بھائی نوروجی، گوکھلے، سریندر ناتھ، فیروز شاہ مہتا، کرشنا سوامی، مدن موہن مالویہ وغیرہ تھے۔

دوسری جماعت انتہاپسندی (گرم فریق) کی تھی جس کا مسلک ہندوستان کی مکمل آزادی تھا۔ وہ ہندوستان سے انگریزوں کا انخلا چاہتے تھے۔ اسکے قائدین بال گنگادھر تلک، بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے اور اروندو گھوش تھے

جو انقلاب کے داعی اور کمل آزادی کے نعرے لگا رہے تھے۔ تلک اس جماعت میں پیش پیش تھے جن کا کہنا تھا کہ:

"آزادی میرا پیدائشی حق ہے اور اسے میں لیکر رہوں گا۔"

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ حسرت نے کالج کی تعلیم کے بعد ہی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور کانگریس میں شمولیت اختیار کی۔ لیکن سورت کانفرنس (۱۹۰۷ء) میں اختلاف رائے ہونے کی وجہ سے وہ تلک کے ساتھ اس جماعت سے کنارہ کش ہوگئے اور صرف تلک مہاراج کی رہبری میں آگے بڑھے۔ وہ تلک کے بہت عقیدت مند تھے، چنانچہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ جب کبھی بھی وہ ان کے دار الاقامہ میں ٹھہرتے اور سیاست پر گفتگو چھڑتی تو مسٹر تلک کا تذکرہ والہانہ انداز سے کرتے۔

دوران نظربندی میں جبکہ علیگڈھ کے مجسٹریٹ نے انھیں اخبارات پڑھنے کی اجازت دے دی تو بیگم حسرت ان کے پسندیدہ اخبارات ان تک پہنچا دیا کرتی تھیں۔ اسی زمانے میں تلک کے مقید ہونے کی خبر ہوئی جس نے حسرت کو بیحد متاثر کیا۔ فرماتے ہیں:

ختم مقدمہ تک اخبار دیکھنے کی اجازت مجسٹریٹ علیگڈھ سے مل گئی تھی اس لئے جن جن اخباروں کی نسبت میری پسند کا انھیں علم تھا، وہ روزانہ بھیج دیا کرتی تھیں۔ وہی روز

کے بعد مسٹر تلک[1] کی گرفتاری کا علم ہوا۔ جس کے افسوس میں راقم کو اپنی تمام مصیبتیں فراموش ہوگئیں۔ مسٹر تلک کے ڈیفنس ایڈریس کو پڑھ پڑھ کر البتہ روح تازہ اور ہمت بلند ہوتی تھی اور مجھکو تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ایڈریس کی سماعت کے بعد اگر جج انصاف سے کام لے گا تو مسٹر تلک ضرور بری ہو جائیں گے۔ لیکن جسٹس داور کے فیصلہ نے ان ساری امیدوں کا خون کر دیا۔ اسی کبیدگی خاطر کے دوران میں ایک رباعی ذہن میں آئی تھی وہ نذر ناظرین ہے ؎

طاعت ہے فرنگیوں کی جبکا دستور
کیا خاک انھیں دادگری کا ہو شعور
انصاف کے دشمنو! داور ہے لقب
برعکس نہند نام زنگی کافور"

قید فرنگ سے حسرت نے جب نجات پائی تو اُن کے حوصلوں اور اُمنگوں میں بلا کی بلندی آگئی۔ اب وہ اور زیادہ بیباک نظر آنے لگے تھے

---

[1] تلک کا ایک مضمون مرہٹی اخبار "کیسری" میں شائع ہوا تھا۔ حکومت نے جس پر مقدمہ چلایا تھا اور تلک کو ۶ ماہ قید با مشقت کی سزا ہوئی۔

ان کے بعض مخلص دوستوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ پالیٹکس سے علیحدگی اختیار کرلیں۔ کچھ نے کہا کہ مسلم لیگ کی پالیسی کو اپنائیں اور چند لوگوں نے یہ بھی کہا کہ وہ فریقِ نرم کی پیروی کریں لیکن حسرتؔ بات کے دھنی اور عزم کے پکے تھے۔ اعتدال پسند جماعت یا دوسری جماعتوں سے وہ متفق نہ ہوسکے کیونکہ ان کا نصب العین ہندوستان کی مکمل آزادی تھا، فریقِ گرم کے نظریات وہی تھے جو حسرتؔ چاہتے تھے یعنی ؎

اُٹھے ہیں جفا پیشگانِ مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر
تقاضائے غیرت یہی دوستو ہے
کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر

چنانچہ انھوں نے صاف طور سے اپنے احباب اور دوستوں سے کہا:

"پالیٹکس میں ہم مقتدائے وطن پرستاران مسٹر تلک اور سرگروہ احرار بابو آربندو گھوش کی پیروی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس حیثیت سے فیروز شاہی کانگریس سے ہم کو اتنی بیزاری ہے جتنی اسیری مسلم لیگ یا نوزائیدہ لال چندی کانفرنس سے۔"

حسرتؔ نے تلک کی مدح میں دو نظمیں کہی ہیں جو ان کی سچی عقیدت مندی کا

اظہار کرتی ہیں ؎

آزادیٔ ہند کی خواہش کو مقبولِ خواص و عام کیا
دل اہلِ ستم کے بیٹھ گئے، وہ بال تلک نے کام کیا
سب ہند کے گرم اخباروں میں مضمون لکھے کیسے کیسے
جس سے کہ فرنگی ڈرتے تھے اس کام کو سرانجام کیا
ہو جور و جفا یا ظلم و ستم ہٹنے کے نہیں پیچھے کو قدم
جس نے یہ کہا دب جائیں گے ہم، واللہ خیالِ خام کیا
بلونت تلک اے فخرِ وطن بے جرم اسیرِ دامِ محن
یاد آئی تری جس دم فوراً حسرتؔ نے جھک کے سلام کیا

دوسری نظم دسمبر ۱۹۱۰ء کی ہے۔ اس نظم میں بھی تلک سے عقیدت مندی جلوہ گر ہے ؎

اے تلک اے افتخارِ جذبۂ حبِّ وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
تجھ سے قائم ہے بنا آزادیِ بے باک کی
تجھ سے روشن اہلِ اخلاص و وفا کی انجمن
تجھ سے لوگوں نے لیا خود اعتمادی کا سبق
ہو گئے دستتی اعدائے محبانِ وطن

دل میں ہے اک آگ حریت پرستی کی لگی
حبِ جاہ و مال باقی ہے نہ فکرِ جان و تن

ورنہ جور انگیزی و محکومی اختیار سے
ہو گئی تھی چاپلوسی ہندوالوں کی چلن

سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزندِ ہند
خدمتِ ہندوستاں میں کلفتِ قید و محن

ذات تیری رہنمائے راہِ آزادی ہوئی
تھے گرفتارِ غلامی، ورنہ یارانِ وطن

تو نے خودداری کا سکھلائے تلک ایسا فسوں
یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسمِ کہن

قدرِ آزادی سے واقف ہو گئے پیر و جواں
مٹ گئی لوگوں کے دل سے ہیبتِ دار و رسن

ناز تیری پیروی پر حسرتِ آزاد کو
اے تلک رکھے تجھے تا دیر ربِ ذوالمنن

حسرت ایک مضمون[1] "نیشنل کانگریس کا خاتمہ" میں "مسٹر تلک" کی سرخی سے رقمطراز ہیں:

---

[1] اردوئے معلیٰ ۱۹۰۸ء

"جن کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر حریت و وطن پرستی کو اپنی ذاتِ پاک پر ہزارہا ناز ہیں۔ جنھوں نے اپنی ساری عمر اور ساری ہمت ملک اور صرف ملک کی خدمت میں صرف کر دی۔ جنھوں نے عیش و آرام اور مال و آزادی کو ہاتھ سے دینا بخوشی گوارہ کیا۔ اعلانِ کلمۂ حق سے باز نہ آئے۔ جن کے معتقدوں کو اس بات پر بجا ناز ہے کہ ہمارے لیڈر نے اپنی زبان سے کبھی کوئی بات ایسی نہیں نکالی جسے بعد میں کسی کے خوف سے یا گوکھلے کی طرح بعذرِ مصلحت بھی واپس لینا پڑا ہو۔ جو رہنمائی کے بلند ترین مرتبہ پر فائز ہونے کے باوجود اصولِ جمہوریت کے اس درجہ پابند ہیں کہ انھیں عوام کے ساتھ رہنے بسنے، کھانے پینے، لیٹنے بیٹھنے، صلاح و مشورہ کرنے اور بعض اوقات ان کی رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دینے میں تامل کرنے کے بجائے حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ جنکی صحبت میں بیٹھنے سے روحوں کو بالیدگی اور حوصلوں کو بلندی حاصل ہوتی ہے۔ جنھوں نے ملک کی خاطر سخت سے سخت مصائب کو بخوشی برداشت کیا اور اب بھی

برداشت کرنے پر آمادہ ہیں جو اپنے ہم وطنوں کو ذلیل نہیں سمجھتے بلکہ ان کی ظاہری اور باطنی قابلیتوں پر اعتماد کر کے اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ ایک دن وہ اپنی ضائع شدہ قوت و عزت کو یقیناً دوبارہ حاصل کریں گے۔ غرضیکہ جن کی عمر کا ہر لحظہ اسی فکر میں گزرتا ہے کہ کسی طرح ہندوستان اور اہل ہندوستان کو آزادی نصیب ہو۔ بس "

ایک شعر اور سن لیں۔ اس میں تلک سے عقیدت مندی کا اظہار ملتا ہے ؎

مغموم نہ ہو خاطر حسرت! کہ تلک تک
پیغام وفا بادِ صبا لے کے گئی ہے

تلک کے ساتھ حسرت کو جو ربط اور وارفتگی، خلوص اور عقیدت مندی قائم ہوئی تھی وہ ہمیشہ ترقی پذیر رہی، اخلاص اور عقیدت مندی کا یہ سلسلہ ان کی موت تک وابستہ رہا۔ تلک کے انتقال پر وہ مرثیہ خواں ہیں ؎

ماتم نہ ہو کیوں بھارت میں بپا دنیا سے سدھارے آج تلک
بلونت تلک مہاراج تلک، آزادی کے سرتاج تلک
جب تک وہ رہے دنیا میں رہا ہم سب کے دلوں پر زور ان کا
اب رہ کے بہشت میں نبھو خدا حوروں پہ کریں گے راج تلک
ہر ہندو کا مضبوط ہے جی گیتا کی بات ہے دل پہ لکھی

آخر میں جو خود بھی کہا ہے یہی "پھر آئیں گے مہاراج تلک"

یہ تو تھی حسرت کی وابستگی تلک کے ساتھ۔ اب حسرت کی نگاہوں کی دوررسی دیکھئے۔ اسی زمانہ میں ان کو اس بات کا کامل یقین تھا کہ ہندوستان آزاد ہوکر رہیگا اور انگریزوں کے ظلم و استبداد سے اس کو آزادی ملے گی۔ چنانچہ اسی یقین محکم کے ساتھ وہ لکھتے ہیں:

"..... دنیا کی رفتار اور اہل دنیا کے طبائع کا میلان صریحاً حریت کی جانب ہے۔ چنانچہ خوابیدہ براعظم میں بھی ہندوستان کے سوا اور کوئی بڑا ملک اس وقت آزادی کی نعمت سے محروم نہیں ہے۔ پس عقل سلیم کسی طرح باور نہیں کر سکتی کہ تمام عالم میں صرف ہندوستان ایسا ملک باقی رہے جس کی قسمت میں محکومی دوام کی ذلت لکھ دی گئی ہو۔ ایسا گمان بظاہر مشیت ایزدی کے سراسر خلاف نظر آتا ہے ....

...... غرضیکہ ارباب دانش و بینش کو یہ بات ماننی پڑے گی کہ فرنگی حکومت کا غیر طبعی نظام ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں قائم نہیں رہ سکتا اور موجودہ صورت میں تو اس کا چند سال رہنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔"

کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے حسرت آزادی کی لطافتوں سے لذت اندوز ہو چکے تھے

ان کا ضمیر غلامی کی لعنتوں سے انھیں وادیِ حریت میں لیجانا چاہتا تھا اسلئے
وہ اطاعت غیر کے خلاف یوں آواز بلند کرتے ہیں ؎

غیر ممکن ہے ہم سے طاعتِ غیر
اے جفاکار، اے غریب آزار

انھوں نے حالی اور اکبر کی طرح قوم کی پستی، غفلت اور مردنی کا ماتم نہیں کیا بلکہ
قوم کو تدبیر کرنے کا سبق سکھایا جو کہ ترقی کی ضامن ہے ؎

تدبیر نسخۂ ترقی ہے غافلو!
تقدیر نوحہ خوانِ تنزل کہاں تک

اور پھر ہندوستانیوں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ اپنی فنی صلاحیتوں اور کدوکاوش
سے اس خارزار کو جنت نما بنائیں اور کسی حالت میں بھی غلامی کی طرف ذہن
کو نہ موڑیں ؎

خدمتِ اہلِ جور کی کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

وہ اپنے قول کی استواری اور عزم بالجزم کا ثبوت اس طرح دیتے ہیں ؎

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کبھی خدمتِ انگریز نہ کرتے

جب فرنگیوں نے ظلم و ستم میں زیادتی کردی تو حسرت نے اسے اچھا شگون سمجھا ؎

اچھا ہے اہلِ جور کئے جائیں سختیاں
پھیلے گی یونہی شورشِ حبِ وطن تمام
سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریبِ مرگ
مغرب کے یوں ہی جمع ہیں زاغ و زغن تمام

بندشوں میں اضافہ ہوتا گیا، حکومت نے جلسے جلوس، اخبارات اور مظاہروں
پر پابندیاں لگانی شروع کردیں۔ لیڈروں کی نقل و حرکت پر سخت نظر
پڑنے لگی۔ ادھر منٹو مارلے اصلاحات وغیرہ بیکار ثابت ہوگئیں تو عوام
میں کھلبلی پھیلنے اور بے چینی بڑھنے لگی۔ جوش و خروش میں شدت پیدا ہونے
لگی اور جوں جوں سختیوں اور پابندیوں میں زیادتی ہونے لگی عوام حریت
کی طرف کھنچنے لگے۔ بیداری پھیلنے لگی اور فرنگیوں نے دیکھا ع

بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

حسرت کی یہ غزل ملاحظہ ہو ؎

رسمِ جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حبِ وطن مستِ خواب دیکھئے کب تک رہے
دل پہ رہا مدتوں غلبۂ یاس و ہراس
قبضۂ شرم و حجاب دیکھئے کب تک رہے
تا بکجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب

ضبط کی اُگوں میں تاب دیکھئے کب تک رہے

دولتِ ہندوستان قبضۂ اغیار میں

بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

خدمتِ باطل میں ہے فرقۂ زم آج کل

حق سے اسے اجتناب دیکھئے کب تک رہے

پال دہنگ کا جو ہیں درپئے اظہارِ حق

باغی و مفسد خطاب دیکھئے کب تک رہے

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم

جبر بہ زیرِ نقاب دیکھئے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں کوششِ تخریب کا

خلقِ خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے

ہو گئی بے غلل، دیکھئے کیونکر ملے

کشمکش انقلاب دیکھئے کب تک رہے

ہے تو کچھ اکھڑا ہوا بزمِ حریفاں کا رنگ

اب یہ شراب و کباب دیکھئے کب تک رہے

حسرتِ آزاد پہ جورِ غلامانِ وقت

از رہِ بغض و عتاب دیکھئے کب تک رہے

حسرت کردار کے غازی تھے، وہ جو کچھ کہتے تھے اس پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ ان کی دور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان کی مردہ اور بے جان صنعتوں کو اس وقت تک فروغ حاصل نہ ہوگا جب تک اس کی طرف ہندوستانی رجوع نہ ہوں گے۔ اس لئے انھوں نے سودیشی تحریک کو اپنایا اور ایک سودیشی اسٹور قائم کیا جو کہ خوب چل پڑا تھا۔ علامہ شبلی کا اشارہ اس جملہ میں اسی طرف ہے:

"تم آدمی ہو یا جن۔ پہلے شاعر تھے، پھر پالی ٹیشین بنے اور اب بنئے ہو گئے۔"

حسرت کو اس تحریک میں اس قدر غلو تھا کہ غیر ملکی کپڑوں کو ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی حسرت کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

"میں حسرت صاحب کو اپنے کلبۂ احزان میں لایا۔ چھت پر جو کو ٹھا اس میں بستی اور گورکھپور کے کچھ احباب تھے جو کرشچین کالج میں پڑھتے تھے، آرام کے خیال سے رات کو سونے کے لئے وہاں ان کا انتظام ہوا۔ ہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ اس وقت سیاست میں سودیشی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ میزبانوں نے ان کے پائتانے کمبل رکھ دیا تھا، وہ کمبل ولایتی تھا۔

حسرت نے رات سردی میں اسی طرح کاٹ دی، مگر کمبل نہ اوڑھا"

حالات دسمبر ۱۹۰۸ء

حسرت کا جوشِ عمل قید فرنگ کی بنا پر اور بھی ترقی کر گیا تھا۔ وہ اردوئے معلیٰ کے ذریعے شرابِ حریت لوگوں کو پلا رہے تھے اور آزادی کا متوالا بنانے میں منہمک تھے۔ جیمس مسٹن کی گورنمنٹ کو اردوئے معلیٰ کھٹکنے لگا چنانچہ ہندوستان میں جو مطبع سب سے پہلے قانون مطابع کی زد میں آیا وہ حسرت کا پریس تھا۔ جسکی کل کائنات ایک لکڑی کی دستی مشین تھی اور دو پتھر۔ ایسے معمولی پریس سے تین ہزار کی ضمانت طلب کی گئی۔ حسرت ضمانت کی رقم نہ دے سکے چنانچہ انھیں رسالہ اردوئے معلیٰ اور پریس کو بند کرنا پڑا۔ اسی زمانہ میں طرابلس اور اٹلی کے درمیان جنگ چھڑی۔ حسرت نے مسلمانانِ ہند کو اٹلی کا مکمل بائیکاٹ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان نے عالم اسلامی کو بے چین کر دیا۔ پھر ہندوستان میں واقعہ کانپور ہندوستانی مسلمانوں کے اضطراب کا باعث بنا۔ اس دوران میں حسرت چپ نہ بیٹھے بلکہ خاموشی سے قوم کی خدمت کرتے رہے۔

پہلی عالمگیر جنگ کا زور ۱۹۱۴ء میں شروع ہوا تو مسلمانوں کی سیاسی حالت کچھ عجیب تھی۔ ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تو مسلمان جرمنی کے ہمدرد اور بہی خواہ ہو گئے لیکن چالباز فرنگیوں نے جلد ہی ایک چال چلی حاکم مکہ شریف حسین

اور اسکے بیٹے امیر فیصل کو ترکی کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ مسلمانوں نے شریف حسین سے نفرت اور بیزاری ظاہر کی۔ جسکی وجہ سے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب صدر دارالعلوم دیوبند" حجاز میں گرفتار کر لئے گئے اور مالٹا بھیج دیے گئے۔ مولانا محمد علی چھندواڑہ میں اور مولانا ابوالکلام آزاد رانچی (بہار) میں نظر بند کر دیے گئے۔

اسی زمانے کی بات ہے کہ مسلمانوں میں آزاد یونیورسٹی کی تحریک زوروں پر چلی ہوئی تھی۔ حسرت، محمد علی اور ابوالکلام آزاد اس تحریک کے بانی اور داعی تھے۔ جب تک مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد مقید نہیں ہوئے تھے، وہ اس تحریک کو آگے بڑھا رہے تھے۔ لیکن جب یہ دونوں جیل میں ڈال دیے گئے تو اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے سب سے پہلے حسرت آگے بڑھے۔ لکھنؤ میں فونڈیشن کمیٹی کا جلسہ طلب کیا گیا۔ حسرت نے محسوس کیا کہ محمد علی اور آزاد کی غیر موجودگی میں جماعت احرار کی شکست ہو جائیگی۔ اس جماعت کی کامیابی کے لئے انھوں نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ لوگوں سے ملے اور ان سے کثرت سے اس جلسہ میں شریک ہونے کی درخواست کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعت احرار کو شکست نہیں ہوئی۔ اسی جلسے سے آنے کے دو تین دن بعد مئی ۱۹۱۶ء میں حسرت دوبارہ جیل میں ڈال دیے گئے۔ حسرت کا یہ شعر اسی موقع کا ہے جس میں انھوں نے سن آٹھ کے مقید ہونے اور مصیبتوں کی طرف اشارہ کیا ہے

حادثے سن اُنّیس میں گزرے بہت اب دیکھئے
کیا دکھائے گردشِ لیل و نہار اکّی برس

اس مرتبہ حسرت کو کئی جگہ مقید رکھا گیا۔ پہلے علیگڈھ جیل میں رہے وہاں سے للت پور لائے گئے۔ علی گڈھ سے للت پور کے اثنائے راہ میں حسرت نے ایک غزل کہی جس کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

سرِ حاضر ہے جو ارشاد ہو مرجانے کو
کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو

للت پور سے حسرت کو جھانسی کے جیل میں لایا گیا۔ جس کا اشارہ اس شعر میں ملتا ہے ؎

حسرت آئے گی تسلی کو یہاں روحِ شمیم
قید ہو آئے ہیں جھانسی جو للت پور سے ہم

جھانسی کے بعد الٰہ آباد، پرتاب گڑھ، فیض آباد، لکھنؤ، فیض آباد، میرٹھ کے جیل خانوں میں بالترتیب رہے۔ میرٹھ اور فیض آباد کا ذکر اس شعر میں کیا ہے ؎

کیا وہ اب نادم ہیں اپنے جور کی روداد سے
لائے ہیں میرٹھ جو آخر مجھ کو فیض آباد سے

۱؎ الناظر جون ۱۹۱۹ء

اس مرتبہ بھی جیل کی زندگی میں حسرت پر بڑے بڑے مظالم ڈھائے گئے لیکن ان کی پیشانی پر بل نہ پڑا۔ برخلاف اس کے ان کے عزائم میں بلندی، خیالات میں پختگی اور فکر میں جامعیت بڑھتی گئی۔ وہ کہتے ہیں ؎

روح آزاد ہے خیال آزاد
جسمِ حسرت کی قید ہے بیکار
باطن میں ہیں آزاد بظاہر ہیں نظربند
ہیں دیدۂ دل بازیہاں دیدۂ سربند
ہوئیں ناکامیاں، بدنامیاں، رسوائیاں کیا کیا
نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہوا داری

فرنگیوں کے مظالم انتہا پر پہنچ چکے تھے حسرت ان سے مخاطب ہیں ؎

یہ آخر تا کجا مشقِ جفا، کچھ حد بھی ہے ظالم!
زمانہ ہو گیا پامال تیری ترکتازی کا

حسرت جب جیل سے باہر آئے تو انھیں خبر ہوئی کہ لوگوں نے فونڈیشن بل کو منظور کر لیا۔ اس واقعہ نے انھیں بے حد متاثر کیا۔ اس کی منظوری کے سلسلے میں صوبہ بہار کے دو مسلمان لیڈر مظہر الحق اور الفقار آگے آگے تھے۔ حسرت نے ذیل کے اشعار میں ان دونوں سے بیزاری ظاہر کی ہے ؎

گو بظاہر شہر ہوں، باطن میں پودے دل کے ہیں
مظہر الحق نام ہے، پیرو مگر باطل کے ہیں
فوج کو اچھی ہی دینا رل کے دشمن سے، شکست
پہ نتیجے آپ ہی کی فکر لاطائل کے ہیں
ناز تھا شوقِ شہادت پر ابھی کل تک جنھیں
دست و بازو آج گویا خود ہی وہ قاتل کے ہیں
مل چکی سرکار استبداد میں جائے امام
حوصلے بے کار اس تجویز بے حاصل کے ہیں!
پائیں گے البتہ آغا خان ثانی کا خطاب
گرچہ یہی انداز ان کی فہم ناقابل کے ہیں
مظہر و انصار و مظہر نے یہ ثابت کر دیا
ہم میں اب تک کچھ نمونے ناظم و کامل کے ہیں
کیوں نہ ہو خطرے میں حسرت قافلہ احرار کا
راہزن ہوں جب وہی، جو راہبر منزل کے ہیں

سنہ ۱۹۳۰ء میں انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہوئی جس میں حکومت نے گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا۔ اس مرتبہ بھی حسرت مقید کر دیئے

گئے جس کا حال غلام احمد فرقت صاحب کی زبانی سنیئے:

"...... سیاسی[1] میدان میں جہاں تک آزادیٔ وطن کی راہ میں قربانی دینے اور جیل جانے کا سوال تھا، اس میں بھی بڑے سے بڑا دھاکڑ اور جیل کا کندہ ان کے سامنے طفل مکتب کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۰ء میں جب کانگریس نے انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی اور لکھنؤ میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ مولانا جیل نہ جاتے۔ امین الدولہ پارک میں شام کے وقت پارک کے دونوں طرف جیل کی لاریاں کھڑی رہتی تھیں، پارک میں کانگریسی لیڈر حکومت کے خلاف تقریریں کرتے اور یہ لاریاں ان کو بھر بھر کر حوالات پہونچا آتیں۔ اس زمانے میں امین آباد پارک ایسا بارونق نہیں تھا جیسا کہ اب ہے بلکہ اس میں بڑی بڑی گھاس اگی ہوئی تھی۔ مولانا اسی پارک میں گرفتار ہوئے اور جس وقت گرفتار ہوتے جا رہے تھے اس وقت راقم حروف وہاں موجود تھا۔ مولانا اپنی تقریر ختم کر کے جوں ہی

---

[1] "مولانا حسرت موہانی کے لطائف" (آجکل دسمبر ۱۹۵۱ء)

چبوترے سے اترتے، سپاہی آپ کو پکڑنے کے لئے لپکے
پہلے تو مولانا نے سپاہیوں کو ایک طرح کی جھکائی دی۔ اس کے بعد ایک دم سے زمین پر اوندھے لیٹ گئے اور گھاس پکڑلی اب عالم یہ تھا کہ ایک طرف تو دو دو سپاہی مولانا کو اوپر کی طرف کھینچ رہے تھے اور دوسری طرف مولانا جیسے کہ گرہ کی طرح زمین پکڑے ہوئے تھے۔ آخر میں تین سپاہیوں نے زور لگاکر جو مولانا کو پوری قوت سے کھینچا تو جڑ سمیت مولانا اکھڑ آئے اور سپاہیوں نے مولانا کو پارک کے باہر لاری کے دروازے پر گود میں لاکر اس بے دردی سے لاری میں ٹھونس دیا جیسے طرح انجن میں کوئلہ جھونکا جاتا ہے۔ مولانا نوں خندہ کے ساتھ "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ بلند کرتے اور رستے بھر نعرے لگاتے لاری پر جیل روانہ ہو گئے۔"

مہاتما گاندھی اور دوسرے لیڈران ابتدا میں اعلانیہ انگریزوں کی مخالفت کے حق میں نہ تھے اس لئے وہ تلک سے دور دور رہا کرتے تھے۔

جون ۱۹۱۸ء میں جبکہ مانٹیگو چیمسفورڈ[۱] رپورٹ شایع ہوئی جس میں ہوم رول کی پیشکش تھی، اعتدال پسندوں نے اسے لبیک کہا اور اس کا خیرمقدم

۱؎ چیمسفورڈ ۱۹۱۶ء میں ہندوستان کے وائسرائے تھے۔

بڑے جوش وخروش سے کیا۔ لیکن تلک اس ادھوری آزادی کو کب پسند کرتے ناراضگی کا اظہار کیا۔ حسرت نے بھی اسے انتہا پسند عینک سے دیکھا اور غیر اطمینان بخش پایا۔ اس کی دھجیاں یوں اڑاتے ہیں ؎

کس درجہ فریب سے ہے مملو — تجویز ریفارم مانٹیگو[۱]
مشہور زمانہ ہیں مسلّم — دستور کے حسب ذیل پہلو
قانون پہ اختیار کامل[۲] — عمال پہ زور زر پہ قابو
ان میں سے نہ ہو جب ایک کی بھی — کل اے ریفارم میں کہیں بو
کاغذ کے سمجھ پھول ان کو — جن میں نہیں نام کو بھی خوشبو
مدراس کے ڈاکٹر[۳] کا یہ قول — کس درجہ ہے دل پذیر و نیکو
مقصود ہے صرف یہ کہ تا جنگ — ہم سب رہیں صرف ایں تکاپو
اے ہندی سادہ دل خبردار — ہرگز نہ چلے یہ تجھ پہ جادو
کیا پائے گا خاک! پھر جب ان سے — اس وقت بھی کچھ نہ لے سکا تو

ابھی چیمسفورڈ اصلاحات کے چرچے ہو ہی رہے تھے کہ حکومت نے

۱؎ ۱۹۱۷ء میں E. S. Montagu وزیر ہند (سکریٹری آف اسٹیٹ فور انڈیا) تھے
۲؎ Executive, Finance, Law & order یہ تینوں محکمے براہ راست گورنر کے تحت تھے اور Reserved Department کہلاتے تھے اس شعر میں انکی طرف اشارہ ہے۔
۳؎ غالباً یہ مدراس کے ریٹائرڈ جج (ایڈوکیٹ) ڈاکٹر سر سبرامنیا ایر کی طرف اشارہ ہے۔

رولٹ بل بھی منظور کرا لی جس کے مطابق وہ قوانین جو زمانۂ جنگ میں ہندوستانیوں پر لاگو تھے جنگ کے بعد بھی حکومت نے ہندوستانیوں کے خلاف استعمال کرنے کا حق حاصل کر لیا۔ لوگوں میں عام بے چینی پھیل گئی جا بجا غم و غصہ کا اظہار بھی ہونے لگا۔ حاکم و محکوم میں کشیدگی بڑھ گئی شکوہ و شکایات کا جواب حکومت نے تلخی اور روکھے پن سے دیا۔ حسرت کی شاعری ان واقعات سے کافی متاثر نظر آتی ہے ؎

ہمارے شکوہ ہائے سخت جانی پر وہ کہتے ہیں
ابھی دیکھی نہیں ہے آپ نے تیغِ رواں میری
تمھارے جورِ بے پروا سے بھی اب چپ نہیں سکتی
غمِ پنہاں کی شدت سے جو حالت ہے عیاں میری

ان اشعار میں حسرت کا طنز بہت کڑوا ہے ؎

ہیں رضا کار تو ہم پر ہے بہر حال یہ فرض
شکرِ حق لب پہ رہے شکوۂ اعدا نہ کریں
مان لیں فیصلۂ دوست کو بے چون و چرا
فکرِ امروز ہی رکھیں غمِ فردا نہ کریں

وہ ہندوستان سے انگریزوں کا مکمل انخلا چاہتے تھے اور اسی لئے قربانیوں

کے لئے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ قید و بند کا یوں مذاق اڑاتے ہیں ؎

بیکار ڈراتے ہو مجھے قیدِ ستم سے
واں روحِ وفا اور بھی آزاد رہے گی

آزاد ہیں قید میں بھی حسرت ؛ ہم دل شدگانِ خود فراموش
باطن میں ہیں آزاد بظاہر ہیں نظر بند
ہے دیدۂ دل باز یہاں دیدۂ سر بند

وہ اپنے عزم کی پختگی کا ثبوت اس طرح دیتے ہیں ؎

کر کے وہی رہے گا جو دل میں ٹھان لی ہے
روشن ہے ہم پہ حسرت عزم واسور تیرا
بے کار ہے اظہارِ غضب اہلِ ستم کا
ڈرتا ہوں میں اُن سے نہ ڈرونگا نہ ڈرا ہیں
شاہوں کے تکبر سے بھی دب کر نہ رہا ہیں
کس بارگہِ خاص کا آخر ہوں گدا میں

انگریزوں سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑے انگریز حاکم سے بھی مصافحہ کرنا پسند نہیں کرتے تھے حالانکہ لوگ اس زمانہ میں اس کو باعثِ فخر اور شان سمجھتے تھے۔ ایک واقعہ سنیئے۔

تحریکِ خلافت سے پہلے مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے ہند سے ملا

جس میں مولانا محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، سید سلیمان ندوی اور حسرت
شامل تھے۔ سپاسنامہ پیش کرنے اور وائسرائے کی جوابی تقریر کے بعد جب
معانقہ کا وقت آیا تو لوگ شان اور امتیاز محسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ بڑھ
کر معانقہ کرنے لگے لیکن حسرت اس اعزاز کو ٹھکراتے ہوئے باہر نکل آئے۔

حسرت کو دکھ تکلیف اور پریشانیوں نے ہمیشہ گھیرے رکھا۔ نتیجہ
یہ ہوا کہ وہ عیش و عشرت کی زندگی سے دور بھاگنے لگے ؎

غلبۂ یاس نے اس درجہ ڈرایا ہے کہ اب
دور ہی بھاگتے ہیں عیش کے مذکور سے ہم

ٹھیک کہا ہے کسی نے ؏

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

حسرت پر ایسے وقت بھی آئے جبکہ انھیں تنگدستی کا کافی مقابلہ کرنا پڑا
لیکن حسرت کا یہ بڑا کمال ہے کہ انھوں نے ایسے اوقات کا مقابلہ سینہ سپر
ہو کر کیا اور کسی دولت مند کی طرف نگاہ تک نہ کی ؎

رہ گئی شرمِ بے کسی حسرت
مجھ پہ احسان اہلِ زر نہ ہوا
رہ گئی تیرے فقرِ عشق کی شرم
میں جو محتاجِ اغنیا نہ ہوا

بے کار تو اے دولت حسرت کو نہ دے لالچ
ہے تیرے بکھیڑوں سے وہ خاک نشیں واقف

اچھا ہے گوشہ گیرِ قناعت ہوئے جو ہم
تکلیفِ ہمنشینیٔ اہلِ دُوَل گئی

قناعت کی بدولت غایتِ بے احتیاجی نے
فقیری میں بھی ہم کو بے نیازِ اہلِ زر رکھا

اے گریۂ محرومی تو جانِ محبت ہے
تو جانِ محبت ہے ایمانِ محبت ہے
ہوں دولت و حشمت پر اربابِ ہوس نازاں
یاں بے سروسامانی پایانِ محبت ہے
بے گانۂ آسائش، مستغنیٔ آسائش
اے بے خبری حسرت حیرانِ محبت ہے

یہ واقعات حسرت کی انفرادی خصوصیات اور ان کی بلند کرداری
پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ ذیل کا واقعہ انکی انفرادیت اور حریت پسندی
کی شدت کو اور نمایاں کر دیتا ہے

کانگریس سیاسی جماعت تھی جس کا نصب العین ہندوستان
کو طوقِ غلامی سے رستگاری دلانا تھا۔ لیکن اب تک اسکا اعلان

کھلے عام یا ریزولیوشن کے ذریعے نہیں ہوا تھا۔ کھلے بند اس اعلان سے لوگ خوف کھاتے تھے۔ لیکن حسرت جنھوں نے آزادیٔ ہند کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیا تھا صداقت اور حق کے اعلان میں ذرا بھی خوف و ہراس محسوس نہیں کیا۔ فرنگیوں کی کڑی نگاہیں اور جبر و استبداد ان کے عزائم کو کبھی مضمحل نہیں کر سکے۔ چنانچہ حسرت پہلے شخص تھے جنھوں نے ہندوستان کی خود مختاری کا اعلان کیا۔

دسمبر ۱۹۲۰ء میں احمد آباد میں کانگریس کا سالانہ جلسہ تھا گاندھی جی نے اس تاریخ کو ہندوستان کی آزادی کی آخری تاریخ مقرر کی تھی، جبکہ سبجکٹ کمیٹی کا جلسہ ہو رہا تھا حسرت نے ہندوستان کی مکمل آزادی کی تجویز پیش کر دی اور کسی حالت میں بھی تجویز واپس لینے پر تیار نہ ہوئے۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے گاندھی جی کو بلایا گیا۔ انھوں نے بڑی کوشش کی کہ حسرت اس تجویز کو واپس لے لیں مصلحت اور تقاضائے وقت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی مگر حسرت ایسے عذروں سے بیزار ہو چکے تھے ؎

لگا دو آگ عذرِ مصلحت کو ۱؎
کہ ہے بیزار اس شے سے مرا دل

جفا کاری ہے تسلیمِ ستم بھی
نہ ہوگا تابعِ جور و جفا دل

غلط ہے قولِ عقلِ مصلحت کوش
نہ اس جانب کرے گا اعتنا دل

نہ پہنچے گی کبھی کیا گوشِ گل تک
قفس سے اٹھ کے فریادِ عنادل

تو املائے صداقت ہے تو ہرگز
نہ ہوگا پیروِ باطل مرا دل

بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرت
بڑی امید ہے میری، بڑا دل

وہ ہمیشہ قوم کو اس طرح للکارتے تھے ؎

جان کو محوِ غم بنا، دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطعِ رہِ مراد کر

۱؎ حسرت نے یہ غزل ۱۹۱۶ء میں علت پور جیل میں کہی تھی جو الناظر جون ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی تھی

خوش مئے دو روزہ کو عشرتِ جاوداں جان

فکرِ معاش سے گزر، حوصلۂ معاد کر

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو

ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر

قول کو زید و عمر کے اپنے سوا اہم نہ جان

روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

حق سے بہ عذرِ مصلحتِ وقت پہ جو کرے گریز

اس کو نہ پیشوا سمجھ، اس پہ نہ اعتماد کر

خدمتِ اہلِ جور کی کر نہ قبول زینہار

فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

غیر کی جد و جہد پہ تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ

کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر، اعتماد کر

حسرت کے ذہن و دماغ پر یہ چیزیں اثر جمائے ہوئے تھیں۔ وہ گاندھی جی کی مصلحت اندیشی گفتگو پر ایمان کیونکر لاتے ان کی تمام کوششیں بے سود اور تمام تدابیر رائیگاں گئیں حسرت نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس تجویز کو جلسہ عام میں پیش کریں گے اور لوگوں نے دیکھا کہ انھوں نے عام جلسہ میں اس تجویز کو پیش کیا اگرچہ لوگوں نے اس تجویز کا ساتھ انگریزی حکومت کے رعب داب و جاہ و جلال سے مغلوب ہو کر نہیں دیا لیکن ۱۹۲۹ء میں پنڈت نہرو نے جب اسی تجویز کو پیش کیا تو اسے شرفِ قبولیت حاصل ہوا۔

یہ تھے حسرت کے حوصلے اور عزائم۔ آزادی کی لگن کچھ ایسی لگی تھی کہ انھوں نے کبھی بھی مصیبت و آلام کی پرواہ نہ کی۔ خوف و ہراس، ڈر اور جھجک کا ان پر کبھی غلبہ نہیں ہوا، وہ عمل پیہم اور مستقل مزاجی کا سبق اپنے کردار سے دیتے رہے۔ چند سیاسی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

غلبۂ کذب متقد معلوم

حق ہے بے خوفِ کثرتِ افواج

بن کر ہیں رضا کارِ تمنائے فنا ہوں

آوازۂ حق بانگِ درا میرے لئے ہے

ارباب فریب کی یہ بھی ہے ایک چال

بیکار ہے بہتر و بہتری کا خیال

گنجائش بہتری غلامی میں کہاں

لاریب ہے اجتماعِ ضدین محال

کچھ مرے دل ہی سے مخصوص نہیں لذتِ غم

خوش اسی حال میں جو ہیں بھی ہیں آزادی میں

اب تو راہِ رضائے حق پہ قدم

رکھ دیا ہم نے ہرچہ بادا باد

دلِ پسماندگاں نہ ہو ناشاد

یہ تھے حسرت کے حوصلے اور عزائم۔ آزادی کی لگن کچھ ایسی لگی تھی کہ انھوں نے کبھی بھی مصیبت و آلام کی پرواہ نہ کی۔ خوف و ہراس، ڈر اور جھجک کا ان پر کبھی غلبہ نہیں ہوا، وہ عمل پیہم اور مستقل مزاجی کا سبق اپنے کردار سے دیتے رہے۔ چند سیاسی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

غلبۂ کذب متحد معلوم
حق ہے بے خوف کثرتِ افواج

بن کر میں رضاکار مہیائے فنا ہوں
آوازۂ حق بانگِ درا میرے لئے ہے

ارباب فریب کی یہ بھی ہے ایک چال
بیکار ہے بہتر و بہتری کا خیال
گنجائش بہتری غلامی میں کہاں
لاریب ہے اجتماعِ ضدین محال

کچھ مرے دل ہی سے مخصوص نہیں لذّتِ غم
خوش اسی حال میں جو ہر بھی ہیں آزاد بھی ہیں

اب تو راہِ رضائے حق پہ قدم
رکھ دیا ہم نے ہرچہ بادا باد
دلِ پسماندگاں نہ ہو ناشاد

چل رہی ہے ہنوز بادِ مراد
احرار وطن پرست و حق کوشش
تھا جن سے دیارِ صدق آباد
سب ہوگئے بند ایک حسرت
باقی ہے ابوالکلام آزاد

نہیں جو قدر زمانے میں لحن بلبل کی
ہنوز غلغلۂ بوم و زاغ باقی ہے

یہ تمام اشعار حسرت کی حریت پرستی کا اظہار کر رہے ہیں۔

حسرت کو ابتدا میں لیگ سے عقیدت مندی نہ تھی۔ لیکن جب ۱۹۱۳ء میں اس جماعت نے ہندوستان کی خود مختاری کی تجویز پیش کی تو وہ بے حد خوش ہوئے اور اپنی خوشی کا اظہار اکثر و بیشتر جگہ کیا ایک جگہ لکھتے ہیں:

"الحمدللہ کہ مسلم لیگ کا کونسل دسمبر ۱۹۱۳ء کے اجلاس میں خرابی بسیار کے بعد آخر کار سلف گورنمنٹ کو اپنا آخری مقصد تسلیم کرکے ہمارے اس قیاس کو ہمارے تخمینی وقت سے بہت قبل بالکل صحیح ثابت کر دیا جس کا اظہار ہم نے

لہ اردوئے معلی جنوری ۱۹۱۳ء

شروع ۱۹۰۷ء میں کیا تھا۔"

اسی خوش فہمی اور عقیدت مندی نے انھیں لیگ کا ممبر بننے پر مجبور کیا چنانچہ ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں پہلی مرتبہ لیگ اور کانگریس کا اجلاس ایک ساتھ ہوا تھا اور دونوں جماعت میں مصالحت کا امکان پیدا ہو گیا تھا تو حسرت بھی لیگ کی رکنیت میں شامل ہو گئے۔ اور جب تک اس جماعت میں رہے راستی اور سچائی کا اعلان کرتے رہے لیکن بہت جلد ان پر یہ آشکارا ہو گیا کہ یہ جماعت محض نام و نمود اور دکھلاوے کی فدائی اور شیدائی ہے۔ خدمتِ قوم محض ایک ڈھونگ ہے ؎

ہے کسے خدمتِ اسلام کی حرص
لوگ رکھتے ہیں فقط نام کی حرص
دین کا غم ہو تو کیا چیز ہے غم
حرصِ دنیا ہو تو کس کام کی حرص
طلبِ جاہ کہاں تک حسرت
چھوڑ اس آرزوئے خام کی حرص

ایک شعر اور ملاحظہ ہو ؎

کشورِ ہند کی مغلوب رہا ہے اس میں
نام ہی نام ہے اسلام کہاں ہے اس میں

اس شعر میں وہ خود غرض اور خود پرست مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کرتے ہیں ؎

شانِ اسلام کی تخریب میں ساعی جو ہوا
حق تو یہ ہے کہ جفا کار مسلماں نہ رہا

۱۹۳۰ء میں کانگریس اور لیگ کا اجلاس دہلی میں ایک ساتھ ہوا۔ اس جلسہ میں بہت حد تک یہ کوشش کی گئی کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ ڈاکٹر انصاری نے ایک بڑی دلچسپ مدلل اور بصیرت افروز تقریر کی جس میں اس بات کا پر زور طریقہ سے اعلان کیا کہ انگریز اور ان کے ہوا خواہ ان عرب ممالک کو اپنے قبضہ و تصرف سے آزاد کریں۔ اس تقریر میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ ہندو مسلم آپس میں شیر و شکر ہو جائیں، یہ خطبۂ صدارت اس قدر باغیانہ تھا کہ یو۔پی حکومت نے اسے ضبط کر لیا۔ حسرت کا تاثر اس کے متعلق ملاحظہ ہو ؎

خطبۂ لیگ ہے کفارہ گنہگاری کا
اب ہمیں شکوہ نہیں ڈاکٹر انصاری کا
کاش سمجھیں اسے اربابِ حکومت کہ نہیں
دخل اس پیروی صدق میں غداری کا
خود ہی انصاف سے کہئے کہ اشعار کہاں ہے

آپ نے کوئی دقیقہ بھی دل آزاری کا

ان کی مجبوریٔ مظلوم سے ڈر یے کہ جنھیں

اِدّعا آج بھی باقی ہے وفاداری کا

حسرت اس خطبہ سے نالاں نہ ہوں کیوں اہلِ فریب

راز مخفی نہ رہا اُن کی ریاکاری کا

انھیں تصورات اور خیالات کے تحت حسرت نے سنہ ۱۹۲۱ء میں لیگ کے اجلاس کی صدارت قبول کی۔ اس اجلاس کی اہمیت اس وجہ سے بڑھی ہوئی تھی کہ اس کا انعقاد کانگریس، خلافت کانفرنس اور جمعیت العلماء کے ساتھ ساتھ احمد آباد میں ہوا تھا۔ جمعیت العلماء کے صدر ابوالکلام آزاد اور کانگریس کے صدر چترنجن داس تھے۔ لیکن چونکہ وہ مقید تھے اس لئے اُن کی جگہ حکیم اجمل خاں نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ خلافت کمیٹی کی صدارت کی ذمہ داری بھی حکیم اجمل خاں ہی کے سپرد تھی۔ لیگ کے اس جلسہ میں حسرت نے فرنگیوں کو خوب دھمکیاں دیں اور اعلان کیا کہ انھوں نے مسلمانانِ عالم اور خصوصاً مسلمانانِ ہند کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے۔ اسے بدلنا پڑے گا۔

حسرت شروع ہی سے سچی آزادی کے دلدادہ تھے اور ساری عمر اسی لگن میں بسر کی جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں ؎

تحریکِ حریت کو جو پایا قرینِ حق

ہر عہد میں معاونِ تحریک ہم رہے

یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف وقتوں میں مختلف سیاسی جماعتوں سے دلچسپی لیتے رہے۔ لیکن جب انھوں نے ان جماعتوں کو اپنے مطمحِ نظر یعنی مکمل آزادی سے الگ پایا تو ان جماعتوں سے علٰحدگی اختیار کرتے گئے۔ چنانچہ جب کانگریس کی اعتدال پسند جماعت سے بیزار ہوتے ہیں تو انتہا پسندوں سے جا ملتے ہیں کیونکہ وہاں ان کو ان کی آزادی کی لگن کی پیاس بجھتی نظر آتی ہے اور انکے قائد ہمخیال نظر آتے ہیں۔ لیگ کی رکنیت اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ انھوں نے حکومت خود مختاری کا ریزولیوشن پاس کیا جو حسرت کا مقصدِ زندگی تھا۔ لیکن جب وہاں بھی ان کی تشنگی بجھنے نہیں پاتی تو وہاں سے بھی کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ مجلسِ خلافت کو اپنا موئد نہیں پاتے تو اُسے بھی چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور سوشلسٹ جماعت میں داخل ہوتے ہیں۔ مگر

۱؎ بزرگ محترم مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی حسرت کی انکی حیثیت کے متعلق مجھے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ حسرت انگریزی تسلط کے دشمنِ جانی تھے۔ انکی سیاست کا لب لباب بس یہی تھا جس پارٹی میں انکو اسکی پوری توقع ہوتی بس اسی میں شریک ہوجاتے۔ اپنی اسی دھن میں انکی مستقل مزاجی ضد کی حد تک پہونچی ہوئی تھی۔

جب وہ کمیونسٹ جماعت کو بھی آزادی کا علمبردار پاتے ہیں تو اس جماعت میں شمولیت اختیار کرتے ہیں۔

حسرت کے پرچوں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ عرصہ تک ہندوستان میں سوشلزم اور کمیونزم کا بھی پرچار کرتے رہے ہیں۔ اردوئے معلّٰی کے مضامین کی سرخیاں ملاحظہ ہوں:

(۱) روس میں نئے پود کی ترقی۔

(۲) سوشلزم اور ابوالکلام آزاد۔

(۳) چینی مسلمان اور کمیونسٹ اقتدار

(۴) سوشلزم کیا چاہتا ہے؟

(۵) اسلام اور سوشلزم۔

(۶) پنڈت نہرو اور سوشیلزم

یہ مضامین ان کے رجحانات کا صاف پتہ دیتے ہیں۔

۱۹۲۵ء[1] میں جب پہلی کمیونسٹ پارٹی کانفرنس منعقد ہوئی تو حسرت اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر منتخب ہوئے جس میں وہ فرماتے ہیں:

---

[1] "آجکل" جولائی ۱۹۵۳ء میں ۱۹۲۶ء لکھا ہے۔ لیکن حبیب الرحمٰن چاکام اپنے مقالہ "حسرت سیاست داں" میں ۱۹۲۵ء بتلاتے ہیں جبکہ کانگریس کا جلسہ کشمیر میں ہوا تھا۔ سردار جعفری اور کیفی اعظمی صاحبان کا خیال ہے کہ ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ پہلا جلسہ ہوا تھا جہاں خطاب میں کمیونزم تھا

"کمیونزم کی تحریک کاشتکاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم اور خونریزی اور فساد لازم وملزوم ہیں حالانکہ اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم لوگ عدم تشدد کو صرف ضرورت اور مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں اور مہاتما گاندھی کی طرح اس کو ہر حالت میں بطور اصول لازم قرار نہیں دیتے۔"

اور دوسری جگہ اس جماعت کے اغراض ومقاصد کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

"آزادی کامل کا کل جائز طریقوں سے قائم کرنا سوراج کی ہیئت سوویت ریپبلک کی ہو جہاں کمیونزم کے اصولوں پہ عمل کیا جائے۔ سوراج کے قائم ہونے تک کاشتکاروں، مزدوروں کی فلاح وآزادی کی ہر ممکن کوشش کرنا اور اس ضمن میں ہندوستان کی سیاسی جماعت کے ساتھ اس حد تک اشتراک عمل کو جائز رکھنا جس حد تک یہ جماعت ہمارے مذکورہ بالا اغراض کی تائید کرے۔

کمیونزم کے اصولوں کی اشاعت کا سامان کرنا اور جمہور کو اپنا ہمخیال بنانا تاکہ سوراج کے قیام کے ساتھ فوراً اس پر عمل شروع ہو سکے۔"

انھوں نے سوویت سے عقیدت مندی کا اظہار اکثر جگہ اپنے اشعار میں کیا ہے

ہدایت کا زمانہ تشنہ تھا اہلِ سوویت نے
دکھائی سب کو راہِ حریت بے خوف و بیم ہو کر

حسرت کی فکر نے انھیں اس بات کا یقین دلایا تھا کہ کمیونزم ہندوستان میں جڑ پکڑ کر اور پھیل کر رہیگا۔ ایسے یقین کے اشارے ان کے اشعار میں اکثر و بیشتر جگہ ملتے ہیں ؎

لازم[1] ہے یہاں غلبۂ آئینِ سوویت
دو ایک برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

انھوں نے اعلانیہ لینن کی پیروی کا نعرہ بھی لگایا ؎

حریتِ کامل کی قسم کھا کے اٹھے ہیں
اب سایۂ برٹش کی طرف جائینگے کیا ہم
گاندھی کی طرح بیٹھ کے کیوں باتیں کرینگے
لینن کی طرح دیں گے نہ دنیا کو ہلا ہم

انھوں نے ایک ایسے دور کی آمد آمد کی خبر دی ہے جبکہ جور و ستم اور ظلم و تشدد کا

---

[1] بعض جگہ یہ شعر اس طرح ہے ؎

لازم ہو کر ہو ہند میں آئینِ سوویت ؎ دو چار برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

ایک عالم خانہ ہو جائے گا اور لوٹ کھسوٹ کا نام نہ باقی رہے گا ؂

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی
نہ حکّام کا جورِ بیجا رہے گا
زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں
کسی کا نہ منت پہ دعویٰ رہے گا

حسرت سچے مسلمان تھے لیکن کمیونزم کی پیروی کو عیب نہیں سمجھتے تھے ؂

تکمیلِ علاجِ دنیوی کو حسرت
ہے خواہشِ حسنِ عاقبت بھی لازم
درویشی و انقلاب مسلک میرا
صوفی مومن ہوں اشتراکی مسلم

زاں رو کہ بہ نہج ہیبتِ اسلام
فی الجملہ ہے آئینِ سویت قائم

چنانچہ ان کی نگاہیں مسلمانوں پر بھی پڑیں اور ان کی رہبری بھی کرتی رہیں۔ مسلمانوں پر ستم ہونے لگا تو وہ مسلمانوں کو ان کی غفلت اور بے حسی سے ہوشیار بھی کرتے ہیں ؂

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر
مسلماں رہ جائیں یوں خوار ہو کر

اٹھے ہیں جفا پیشگانِ مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر
سمجھتے ہیں سب اہلِ مغرب کی چالیں
مگر پھر بھی بیٹھے ہیں بے کار ہو کر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو!
کہ ہم بھی رہیں اُن سے بیزار ہو کر
کہیں صلح نرمی سے رہ جائے دیکھو!
نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر
ابھی تم کو سمجھے نہیں اہلِ مغرب
بتا دو انھیں گرم پیکار ہو کر
فریب و دغا کے مقابل میں تم بھی
نکل آؤ بے رحم و خونخوار ہو کر
وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت
وفا کے ہیں طالب دل آزار ہو کر

جس زمانہ میں حسرت فیض آباد جیل میں تھے انھیں خبر ملی کہ انگریز ہندوستانی افواج کی مدد سے بغداد پر قابض ہو گئے ہیں۔ حسرت یہ سن کر تڑپ اٹھے اسی بے چینی کی حالت میں یہ نظم کہی ؂

درسِ حق جاری ہے یاں بھی حسرتِ آزاد کا
قید خانہ مدرسہ گویا ہے فیض آباد کا
کامیابی پر غضب نازاں ہیں اربابِ ہوس
ہر طرف اک شور برپا ہے مبارکباد کا
یہ بھی کیا انصاف ہے اے دشمنِ اہلِ وفا
ہم رہیں ناکام یوں اور کام ہو حساد کا
ٹوٹ جائے کیوں نہ ہمت عاشقِ ناکام کی
جب نتیجہ کچھ نہ نکلے کوششِ برباد کا
شاہ جیلانی سے حسرت عرض ہے اسلام کی
یوں نہ ہونا چاہیئے تھا فیصلہ بغداد کا

جنگِ بلقان اور جنگِ ترکی نے مسلمانانِ عالم میں ایک عجیب بے چینی و اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ ترکی کی شکست کے معنی یہ سمجھے کہ اس کی پوری سلطنت جس میں مقاماتِ مقدسہ بھی شامل تھے اغیار کے قبضہ و تصرف میں چلے جاتے جس کے لئے مسلمان ایک لمحہ کے لئے بھی تیار نہ تھے۔

علامہ شبلی و اقبال کی نظموں میں ان کیفیات کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ لیکن حسرت ہی واحد شخص ہیں جن کی غزلوں میں ان تاثرات کا اظہار بھرپور ملتا ہے ؎

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے
اب تو انصاف اس ستم کا دستِ پیغمبر میں ہے
جورِ یورپ ہے بنا بیداریِ اسلام کی
خیر ہے دراصل یہ با شکلِ شر میں ہے
خاطرِ افسردہ میں باقی ہے ابتک یادِ عشق
گرمیِ آتش ہنوز اس مشتِ خاکستر میں ہے
قلتِ افواجِ ترکی پہ نہ ہو اے دل دلگیر
ایک ہے سو کے لئے کافی جو اس لشکر میں ہے
اب خدا چاہے تو حسرت جلد ہوتا ہے بلند
رایتِ حریت و حق جو کفِ انور میں ہے

لائیڈ جارج جو انگلستان کے زمانۂ جنگ کے وزیر تھے ان سے عام مسلمان متنفر اور بیزار تھے۔ وجہ یہ تھی کہ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد حدودِ ترکی ویسے ہی قائم رہیں گے۔ لیکن اختتامِ جنگ کے بعد وہ وعدے سے مکر گئے اور وفدِ خلافت جو مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلینڈ گیا تھا وہ ناکام واپس آیا۔

۱۹۲۲ء میں لائیڈ جارج کی وزارت کو شکست ہوئی تو عام مسلمانوں نے خوشیاں منائیں۔ حسرت بھی زیرِ لب مسکرائے ؎

لائیڈ جارج کی آئی شامت | نکلا عشیک شعیب کا کہنا
ہجری سن میں لکھ دو حسرت | مردک نام کا نکلا شحنہ

حسرت کو نہ صرف اسلامی سیاست سے دلچسپی تھی بلکہ وہ خود پکے مسلمان تھے۔ ذیل کے اشعار میں ان کی زندگی کا یہ رخ نمایاں ہے ؎

میسر ہے[1] شاہِ نجف کی غلامی | زہے کامرانی زہے شادمانی!
ملے مجھ کو بھی مثل سلمان و بوذر | وہی خواجہ تاشی وہی شادمانی
وہ بیخوف و غم کیوں نہ ہوں جنکے پرساں | حقیقت میں شیرِ خدا جنکے حامی
ہو جو چاکر درِ شاہِ مرداں پہ اکثر | خصوصی شرف پا گئے ہم سے عاصی

حسرت نے ۱۹۲۲ء میں سابرمتی جیل میں یہ اشعار کہے ہیں جس میں روحانی[2] امداد کے طالب ہیں ؎

گم رہوں کی رہنمائی کیجیے | یا علی مشکل کشائی کیجیے
خواہشِ ظاہر سے باطن کی طرف | اہلِ دل کی دل ربائی کیجیے
کرکے ہم کو واقفِ اسرارِ عشق | فارغِ زہدِ ریائی کیجیے
جانِ حسرت ہے گرفتارِ مجاز | حکمِ انعامِ رہائی کیجیے

اسی سابرمتی جیل میں حسرت کو روحانی[3] فیض بھی حاصل ہوتا ہے ؎

---

۱ الناظر ۱۹۳۶ء ۲ ۳ اردو ادب حسرت نمبر ۱۹۵۱ء

چلی سابرمتی میں آج کیا ہی | نسیمِ رحمت و فضلِ الٰہی
جمالِ التفاتِ شاہِ جیلاں | ہوا پیدا بہ شانِ کج کلاہی
بہ یک دم دیدیا، دینا تھا جو کچھ | دکھا دی شانِ حسنِ کم نگاہی
شہِ عبد الصمد[1] کا واسطہ تھا | نہ کیونکر سرِّ حق کھلتا کماہی

دلِ حسرت ہوا معمورِ انوار
شہِ رزاق دیتے ہیں گواہی

الغرض وہ اشتراکی مسلم ہونے کے ساتھ ساتھ مذہب پرست بھی تھے جیسا کہ خود انھوں نے کہا ہے ع

صوفی مومن ہوں اشتراکی مسلم

۱۹۲۵ء میں انھوں نے ایک نظم "مقام اشتراکیت" کے عنوان سے لکھی ؎

معیشت میں بہر سو رنگ فطرت ہے جہاں میں ہوں
اخوت ہے جہاں میں ہوں سویت ہے جہاں میں ہوں
مقامِ فرد بھی محفوظ ہے فوزِ جماعت میں
نمایاں ہر طرف وحدت میں کثرت ہے جہاں میں ہوں

---

۱ حسرت کے مرشد کے مرشد۔

اصولِ اشتراک آئینِ بیت المال سے مشتق
اساسِ کار جمع و خرجِ ملت ہو جہاں میں ہوں
فلاحت ہو کہ حرفت، کامیابی سعیِ انساں کی
نظامِ اجتماعی کی بدولت ہے جہاں میں ہوں
بری ہے فکریاں ہر فرد کی لوثِ عقیدت سے
مسلّم اقتدار علم و حکمت ہے جہاں میں ہوں
بلا تائیدِ محنت کچھ بھی افزائش جو ہو حسرتؔ
وہ دولت کے لئے اک طوقِ لعنت ہے جہاں میں ہوں

غالباً کمیونزم سے حد درجہ محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ سرخ رنگ کو بہ نظر پسندیدگی دیکھنے لگے تھے۔ چنانچہ ان کے اکثر اشعار میں سرخی رس بس گئی ہے۔ سید احتشام حسین صاحب اپنے مضمون "حسرتؔ کی شاعری کے نشاطیہ عناصر" میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاید اسے نفسیاتی موشگافی کہا جائے لیکن حسرتؔ کے یہاں سرخ رنگ سے اتنی وابستگی بھی اسی زندہ اور انقلابی رجحان کا پتہ دیتی ہے۔ محبوب کا جسم بھی سرخ ہے اور لباس بھی سرخ......"

چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کھل گیا ہے ترے جمال سے رنگ
تیرے ملبوسِ ارغوانی کا

دلِ دیوانۂ حسرتؔ تو اسی کا ہے ہلاک
وہ گلے میں جو ترے سرخ پڑا ہے تعویذ

راحت کو اضطراب سے مقرون کر دیا
ان سرخ پوشیوں نے تو دل خون کر دیا

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیِ جسمِ ناز میں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے جمال کا

دیکھئے کس کس کو اعزازِ شہادت ہو نصیب
آج نکلا ہے بدل کر رنگ وہ عیارِ سرخ

مل گیا حسرتؔ شہیدانِ وفا کا خوں
ہو گئی ہے روتے روتے ہر دو چشمِ یار سرخ

سرخیِ چشمِ یار سے ہے عیاں
اثرِ مستیِ شبانہ ہنوز

اسی اثر اور کمیونزم سے عقیدت مندی کا نتیجہ تھا کہ ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کی دستور ساز اسمبلی کے نئے دستور کی رائے شماری میں اسمبلی میں حسرتؔ پہلے شخص تھے جنھوں نے سارے ہندوستان کو کمیونزم کی دعوت دی۔

حسرتؔ پر مذہب کا غلبہ تھا لیکن عام کمزور مذہبی انسانوں کی طرح غیر مذاہب سے نفرت اور تعصب ان کا شعار کبھی نہیں رہا۔ وہ ہمیشہ ہندو اور مسلمانوں کو یکجا دیکھنا چاہتے تھے ۔

مٹ چلے یونہی نہ کیوں دیر و حرم کے جھگڑے
ایک رشتہ بھی تو ہے سبحہ و زنار کے بیچ

وہ ہندو مسلم اتحاد و دوستی ہی میں ہندوستان کی ترقی کا راز بتلاتے تھے ۔

کچھ شک نہیں اس میں کہ وطن کی ہے ترقی
ہم رشتگیٔ سبحہ و زنار پہ موقوف

چنانچہ وہ کرشن جی سے بھی عقیدت مندی رکھتے تھے ؎

کچھ ہم کو بھی عطا ہو کہ اے حضرتِ کرشن
اقلیمِ عشق آپ کے زیرِ قدم ہے خاص

حسرت نے ہندوستان کی تقسیم کو کبھی پسند کی نظر سے نہیں دیکھا وہ پاکستان کے مؤید ضرور تھے لیکن علیحدہ ڈومینین کے قائل نہیں تھے یہی وجہ، قائد اعظم محمد علی جناح اور ان کے اختلافات کا باعث بنی۔

حسرت نے ہندوستان میں مسلم لیگ اور کانگریس جماعت کو ملا کر ایک مخلوط حکومت کی تجویز وفاقیہ اتحادیہ Confederation of States کی صورت میں پیش کیا جس کے مطابق ہندوستان میں چھ جمہوری ریاستیں ہوتیں:

(۱) مشرقی پاکستان (۲) مغربی پاکستان
(۳) مرکزی ہندوستان (۴) جنوبی مغربی ہندوستان
(۵) جنوبی مشرقی ہندوستان (۶) حیدرآباد

یہ تجویز حسرت کی اعلیٰ سیاسی فکر اور صلاحیت کا ثبوت دیتی ہے جسے اگر مان لیا جاتا تو یقیناً ہند و پاک کو نئی نئی مصیبتوں سے دوچار نہ ہونا پڑتا اور اس کا شمار دنیا کی عظیم حکومتوں میں ہوتا۔

حسرت کی نگاہ صرف ملکی اور قومی سیاست ہی پر نہیں پڑتی تھی بلکہ بیرونی ملکوں کی سیاست پر بھی وہ نظر رکھتے تھے اور قابل گرفت باتوں پر بے لاگ تنقید کر جاتے تھے ؎

یورپ میں جیسے پھیل گئی ہے وبائے حرص
چلنے لگے نہ سارے جہاں میں ہوائے حرص
ہے چین کو ریا کے مٹانے پہ مستعد
جاپان بھی ہوا ہے مگر آشنائے حرص

حسرت سیاسی دنیا کے باسی تھے۔ ان کی ساری زندگی سیاست سے ہمکنار رہی، مگر ایک بڑی خصوصیت ان میں یہ نظر آتی ہے کہ وہ ہمیشہ ایک مخلص انسان کی زندگی گزارتے رہے اور اپنی ساری زندگی میں خلوص کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ حالانکہ خلوص اور سیاست کا ازل سے بیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خلوص کو تو اپنا لیا لیکن سیاست کی دنیا میں فتحمند نہ ہو سکے۔

"ظ" انصاری صاحب نے ان کی زندگی کے اس رخ پر بڑی اچھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں[1]

" آج مجھے حسرت موہانی مرحوم بہت یاد آئے۔

---

[1] ورق ورق از ظ انصاری صفحہ ۱۶۷ "خلوص کی دو رنگی"۔

بے چارے کل سدھار گئے دنیا سے

ایسا مخلص آدمی بھی کم پیدا ہوتا ہے اور اتنا خلوص جس میں ہو وہ بہت کم مفید رہ جاتا ہے۔

"دیکھتے جاؤ روپیہ اب کی میں نے جمع کر لیا ہے۔ اسمبلی کا الاؤنس بچا بچا کر تھوڑا روپیہ اور ہو جائے تو میں اردو کا مقدمہ یو۔ این۔ او میں لے کر جاؤں گا" یہ بات انھوں نے پچھلے سال ایک پرائیویٹ گفتگو میں کہی تھی۔

بے چارے حسرت موہانی مخلص آدمی

غور کرتا ہوں تو ایسا نظر آتا ہے کہ خلوص وہیں تک اچھی چیز ہے جہاں اسکے بغیر کام نہ چلے اور جہاں اس کے بغیر بھی کام چلتا ہو وہاں خلوص برتنا نقصان دے جاتا ہے۔ پہلی بات میں مسٹر جناح کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے

اور دوسری بات میں حسرت موہانی کی ناکامی کا راز۔

اس راز کو مولانا ابوالکلام نے سمجھا اور جیت گئے۔

اسی راز کو مولانا محمد علی نے نہ سمجھا اور چت ہو گئے۔

ابوالفضل اور فیضی کے باپ شیخ مبارک نے خلوص کی اس دورنگی کو نہ مانا اور دربار اکبری سے نکالے گئے۔

شیخ مبارک کے ذہین بیٹوں نے اسکا گُر مان لیا اور پوری سلطنت کے ستون بن گئے

.. ..

.. ..

خلوص دودھاری تلوار ہے۔ اس کا ہر وقت برہنہ رہنا خطرناک ہے اسکی دُہری دھار سے بڑے بڑے سورما زخمی ہوئے ہیں۔

خلوص کی تاریخ میں بڑے بڑے عبرت کے مقام آتے ہیں۔

بے چارے حسرت موہانی مخلص آدمی"

حسرت کے یہاں سیاست کے ساتھ خلوص بھی ہے اور مذہبیت بھی ان تینوں کو حسرت نے بڑی خوبی سے نباہا۔ خلوص تو اب کہیں ملتا ہی نہیں اب رہا سیاست اور مذہب۔ اس کا یہ حال ہے کہ آج دنیا کے بڑے بڑے لوگ سیاست اور مذہب کے جھمیلوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ اسی بنا پر انکے یہاں نہ سیاست سیاست رہتی ہے اور نہ مذہب مذہب ہی کا روپ دھارتا ہے۔ لیکن حسرت کے یہاں یہ بڑی خوبی ہے کہ انھوں نے دونوں کو علٰحدہ علٰحدہ رکھا اور ایک دوسرے کو ٹکرانے نہیں دیا۔

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

شیخ مبارک کے ذہین بیٹوں نے اسکا گر مان لیا اور پوری سلطنت کے ستون بن گئے

.. ..

.. ..

خلوص دو دھاری تلوار ہے۔ اس کا ہر وقت برہنہ رہنا خطرناک ہے اسکی دُہری دھار سے بڑے بڑے سورما زخمی ہوئے ہیں۔
خلوص کی تاریخ میں بڑے بڑے عبرت کے مقام آتے ہیں۔
بے چارے حسرت موہانی مخلص آدمی۔"

حسرت کے یہاں سیاست کے ساتھ خلوص بھی ہے اور مذہبیت بھی ان تینوں کو حسرت نے بڑی خوبی سے نباہا۔ خلوص تو اب کہیں ملتا ہی نہیں اب رہا سیاست اور مذہب۔ اس کا یہ حال ہے کہ آج دنیا کے بڑے بڑے لوگ سیاست اور مذہب کے جھمیلوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ اسی بنا پر انکے یہاں نہ سیاست سیاست رہتی ہے اور نہ مذہب مذہب ہی کا روپ دھارتا ہے۔ لیکن حسرت کے یہاں یہ بڑی خوبی ہے کہ انھوں نے دونوں کو علٰحدہ علٰحدہ رکھا اور ایک دوسرے کو ٹکرانے نہیں دیا ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

———✲———